اشارات

سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ

اور ___ صدر زرداری کا طبلِ جنگ

پروفیسر خورشید احمد

جمہوریت میں عوام کے ووٹ اور انتخابی عمل کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے لیکن جمہوریت پر اس سے بڑے ظلم کا تصور مشکل ہے کہ اسے محض انتخابی عمل تک محدود کر دیا جائے۔ قیادت کا انتخاب بلاشبہہ عوام کی آزاد مرضی سے ہونا چاہیے اور عوام کے سامنے قیادت کی بار بار جواب دہی انتخابی عمل کا اہم ترین حصہ ہے۔ تاہم جمہوریت کا اصل جوہر قانون کی حکمرانی اور دستور کے تحت تمام اداروں کی کارفرمائی ہے، اوران حدود کی پاس داری ہے جو کاروبارِ ریاست کی انجام دہی کے ضمن میں ہرادارے کے لیے دستور نے قومی اتفاق رائے سے مقرر کی ہیں۔ جمہوری نظام کی کامیابی کے لیے بنیادی حقوق کا تحفظ، عدلیہ کی آزادی، رائے کے اظہار کی ضمانت، صحافت کی آزادی اور قیادت کا پارلیمنٹ، قانون اور عوام کے سامنے جواب دہ ہونا ضروری ہے۔

جمہوری ریاست اور معاشرے میں تمام ادارے دستور اور قانون کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان اداروں کے درمیان مکمل تعاون اور توازن ہی جمہوری نظام کی کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔ جو بھی قانون سے بالاتر ہونے یا دستوری تحدیدات اور مواقع سے ہٹ کر کوئی راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ دراصل جمہوریت پر تیشہ چلانے کا مجرم ہوتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ یہاں جمہوری عمل کو خطرہ باہر کی قوتوں سے کہیں زیادہ، اندر کے طالع آزماؤں اور ذاتی مفاد

کے اسیروں سے رہا ہے۔ اگر قوم اور ملک کی سیاسی قیادت موجودہ حالات میں دستوری نظام اور جمہوری عمل کے آداب و روایات کی مکمل پاس داری کے باب میں کسی طرح کی کوتاہی دکھاتے ہیں تو یہ ملک اور اس کے مستقبل کے لیے نہایت خطرناک ہوگا۔ فوجی آمر سے نجات، عدلیہ کی بحالی اور صحافت کی آزادی سے جمہوری عمل کے فروغ اور استحکام کے جو مواقع پیدا ہوئے ہیں، وہ ذرا سی غلطی سے خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔

قومی مصالحتی آرڈی ننس (این آر او) کے بارے میں ۱۶ دسمبر ۲۰۰۹ء کے سپریم کورٹ کے ۱۷ رکنی فل بنچ کے متفقہ فیصلے سے ملک میں قانون کی حکمرانی کو فروغ دینے اور اسے کرپشن اور بدعنوانی کی سیاست سے بچانے کے جو روشن امکانات پیدا ہوئے ہیں، وہ زرداری گیلانی حکومت کے جارحانہ اور گاہے بچگانہ رویے سے معرضِ خطر میں پڑ سکتے ہیں۔ ۲۷ دسمبر کو بے نظیر بھٹو صاحبہ کی دوسری برسی پر صدر آصف علی زرداری صاحب نے جو تقریر کی ہے اور جس لب و لہجے میں کی ہے، وہ ملک میں جمہوریت کے مستقبل کے لیے ایک فالِ بد اور قومی سلامتی کے لیے خطرے کی گھنٹی کے مترادف ہے۔ زرداری صاحب اور ان کے حواریوں کی طرف سے پہلے بوکھلاہٹ اور پھر تصادم کی سیاست کے اشارے تو ۱۷ دسمبر ہی سے ملنے لگے تھے، لیکن طبلِ جنگ اب ۲۷ دسمبر کو بجایا گیا ہے۔

نام نہاد دہشت گردی کے خلاف امریکا کی جنگ کو جس طرح پاکستان کی جنگ بنا دیا گیا ہے، اس نے ایک طرف ملک کی آزادی اور خودمختاری پر کاری ضرب لگائی ہے، دوسری طرف ملک کو لاقانونیت، تشدد، خانہ جنگی، اور معاشی تباہی کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جس قومی یک جہتی اور سیاسی بالغ نظری کی ضرورت ہے، موجودہ برسرِ اقتدار قیادت کا دامن اس دانش سے خالی نظر آ رہا ہے، اور جس راستے پر یہ قیادت آگے بڑھنے لگی ہے وہ تصادم اور تباہی کا راستہ ہے۔ امریکا کی جنگ سے خلاصی، معاشی مسائل کے حل اور ملک اور جمہوریت کی اصل دشمن قوتوں سے نبردآزما ہونے کے بجاے، وہ عدلیہ، فوج، میڈیا اور حزبِ اختلاف کو نشانہ بنانے کی خطرناک حکمت عملی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ان کا یہ عمل خود ان کے لیے اور پھر وطن عزیز کے لیے ایک خودکش حملے سے کم نہیں۔ یہ وقت تصادم کا نہیں، قومی سلامتی اور پاکستانی قوم اور معاشرے کی حقیقی ترجیحات کی روشنی میں حقیقی قومی مفاہمت پیدا کرنے، اور

دستور کی مکمل پاس داری کے ذریعے درپیش سنگین مسائل کا حل تلاش کرنے کا ہے۔

عوام نے پیپلز پارٹی کو جو اختیارِ حکمرانی فروری ۲۰۰۸ء کے انتخابات کے ذریعے دیا تھا، بدقسمتی سے اسے موجودہ حکمرانوں نے یکسر نظرانداز کر دیا ہے، اور اس کی ساری تگ و دو ذاتی مفادات کے حصول پر مرکوز نظر آ رہی ہے۔ بدانتظامی اور بدعنوانی کے سیلاب نے پورے ملکی نظام کی چولیں ہلا دی ہیں۔ اس لیے وقت کی ضرورت ہے کہ سیاسی قیادت ہوش کے ناخن لے اور اصل مسائل کے حل کے لیے مل جل کر حکمت عملی اور نقشۂ کار بنانے اور اس پر سختی سے کاربند ہونے کا راستہ اختیار کیا جائے۔

سپریم کورٹ نے ۳۱ جولائی اور ۱۶ دسمبر ۲۰۰۹ء کے فیصلوں کے ذریعے جو شمع روشن کی ہے، اس سے تاریکیوں کا سینہ چیر کر ملک کو ایک روشن مستقبل کی طرف لے جایا جاسکتا ہے۔ اس کا راستہ باہم مشاورت، دستور کا احترام، قانون کی پاسداری، مفاد کی سیاست سے اجتناب اور ملک کی آزادی، سلامتی اور نظریاتی تشخص کی حفاظت کے ساتھ عوام کی مشکلات اور مصائب کو حل کرنے کی بھرپور کوشش ہے۔ پاکستان نہ کل ایک ناکام ریاست تھا اور نہ آج ایسا ہے۔ ناکامی اگر ہے تو وہ قیادت کی ہے اور ابھی وقت ہے کہ حالات کو تباہی کے راستے پر جانے سے بچانے کے لیے قومی یک جہتی کے حصول اور صحیح حکمت عملی کی ترتیب و تنفیذ کا اہتمام کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نام نہاد قومی مصالحتی آرڈی ننس کی اصل حقیقت اور عدالتِ عظمٰی کے فیصلے کے مضمرات اور تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے۔ این آر او زدہ قیادت نے حالات کو جو زاویۂ نظر دینے کی کوشش کی ہے، اس کا پردہ چاک کر کے اصلاح اور نجات کی راہ کو واضح کیا جائے۔ پاکستان کی آزادی اور خودمختاری، دستور، قانون اور پارلیمنٹ کی بالادستی کو یقینی بنایا جائے تاکہ بدعنوانی کی سیاست سے نجات اور عوام کے حقوق کی حفاظت اور مسائل کے حل کی عوامی جدوجہد میں سرگرم حصہ ادا کیا جاسکے۔

ملکی تاریخ کا شرمناک باب

وہ آرڈی ننس جو جنرل پرویز مشرف نے فوجی وردی میں اپنے ناجائز صدارتی انتخاب (۶ اکتوبر ۲۰۰۷ء) سے صرف ۲۴ گھنٹے پہلے 'قومی مصالحت' کے نام پر جاری کیا تھا، وہ پاکستان کی تاریخ کا نہایت شرمناک فرمان تھا۔ یہ فرمان دنیا کی تاریخ میں اس پہلو سے منفرد تھا کہ بدعنوانی تو

انسانی زندگی پر ایک بدنما اور قابلِ مذمت داغ کی حیثیت سے ہمیشہ سے رہی ہے، لیکن اس داغ کو 'مفاہمت' کے نام پر دستور، قانون، اخلاق اور سیاسی اصول و آداب کا خون کر کے بے حمیتی کے ساتھ دو سیاسی قوتوں کا اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اسے قانون قرار دینا، اور اس سیاہ کاری کو 'تمغاے بحالی جمہوریت' کا نام دینا نہ ماضی میں کہیں دیکھنے میں آیا اور نہ مستقبل میں کسی مہذب معاشرے میں یہ ممکن ہوگا لیکن یہ سیاہی جنرل پرویز مشرف اور پیپلز پارٹی کی قیادت نے نہ صرف اپنے چہرے پر مَلی بلکہ پاکستان کے چہرے کو بھی داغ دار کیا۔ اب کہ جب سپریم کورٹ نے سیاسی قیادت کو اصلاحِ احوال کا ہر موقع فراہم کرنے کے بعد اس نام نہاد 'قانون' کو کالعدم قرار دیا ہے تو اپنی غلطی کے اعتراف کے بجاے جمہوریت کے خلاف سازشوں کا افسانہ تراشا جارہا ہے اور ملک کو ایک نئے تصادم اور انتشار کی طرف لے جایا جارہا ہے۔

ریکارڈ کی درستی کے لیے ضروری ہے کہ قوم کے سامنے تمام حقائق بے کم و کاست پیش کیے جائیں۔ حق وانصاف اور پاکستان اور جمہوریت کے مفاد میں وہ راستہ اختیار کیا جائے، جو اصلاحِ احوال کا ذریعہ بنے، خواہ اس کی کوئی بھی قیمت کسی کو ادا کرنی پڑے۔ ہم ان تمام حقائق کو جن کو سمجھے بغیر قوم اصل صورتِ حال کا ادراک اور خرابیوں کی تلافی کا اہتمام نہیں کرسکتی، پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

میثاقِ جمہوریت جس پر لندن میں ۱۴ مئی ۲۰۰۶ء کو دیگر چھوٹی پارٹیوں کے علاوہ پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سربراہ میاں محمد نواز شریف نے دستخط کیے اور جس کی تیاری میں تقریباً دو سال لگے، اس معاہدے کو سب ہی نے پاکستان میں جمہوریت اور دستور کی بالادستی کی طرف ایک سنگِ میل قرار دیا۔ اس میں مِن جملہ اور عہد و پیمان کے، یہ باتیں طے کی گئی تھیں:

ا- بدعنوانی اور سیاسی انتقام سے نجات اور اربابِ اختیار کی حقیقی اور مبنی بر انصاف جواب دہی کے لیے ایک 'سچائی اور مفاہمت کا کمیشن' (Truth and Reconciliation Commission) قائم کیا جائے گا، جو ۱۹۹۶ء سے تمام حالات کا جائزہ لے کر ملک کے مجرموں کی گرفت کرے، اور سیاسی انتقام کا نشانہ بننے والوں کی پاک دامنی کے اظہار کی راہ ہموار کرے۔

ب- عوام کے مینڈیٹ کے مکمل احترام کے ساتھ اس میں یہ بھی عہد و پیمان کیا گیا تھا کہ:

> ہم کسی فوجی حکومت، یا فوج کی حمایت یافتہ حکومت میں شامل نہیں ہوں گے۔ کوئی پارٹی جمہوری حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے، یا اقتدار میں آنے کے لیے فوج کی حمایت حاصل نہیں کرے گی۔

لیکن جس وقت اس میثاق کی نوک پلک درست کی جارہی تھی اور اس پر دستخط ثبت کیے جارہے تھے، اسی وقت پیپلز پارٹی کی قیادت، دوسری سیاسی پارٹی (مسلم لیگ ن) اور قوم کو تاریکی میں رکھ کر جنرل پرویز مشرف اور اس کے باوردی نمایندوں سے سیاست کے نئے نقشے کے خدوخال طے کر رہی تھی جس کا حاصل نام نہاد 'قومی مصالحت کا آرڈی ننس' ہے۔ اس کا اعلان پرویز مشرف نے ۵/اکتوبر ۲۰۰۷ء کو کیا اور پیپلز پارٹی کی قیادت نے اسمبلیوں سے استعفا دینے کے بجاے پرویز مشرف کے بے معنی صدارتی انتخاب کے بعد، اس کے ساتھ سیاسی اشتراک کا معاملہ طے کیا۔ اس طرح ملک پر وہ قانون مسلط کیا جس کے ذریعے قومی دولت لوٹنے، اختیارات کے غلط استعمال کرنے اور حتیٰ کہ فوجداری جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو دستور، قانون اور اخلاق کے تمام تقاضوں کو بالاے طاق رکھ کر 'پاک دامنی' کا سرٹیفکیٹ دیا جاسکے، تاکہ وہ اس ناپاک غسل کے ذریعے ایک بار پھر قوم کی قسمت سے کھیلنے کے لیے اقتدار پر براجمان ہوسکیں۔

جنرل پرویز مشرف سے اس زمانے میں سارے معاملات طے کرنے کی داستان خود بے نظیر صاحبہ نے اپنی کتاب Reconciliation (مفاہمت) میں بیان کی ہے، جس سے چند اقتباس صرف اس لیے پیش کیے جارہے ہیں کہ اس دوغلی سیاست کا اصل چہرہ خود ان کے الفاظ میں دیکھا جاسکے: ''مشرف کے دور کے آغاز سے ہی اس کی حکومت اور پیپلز پارٹی کے درمیان مسلسل مکالمہ جاری رہا''۔ (ص ۲۲۳)

اس کا ایک نمونہ موصوفہ کے الفاظ میں وہ رابطہ بھی ہے جو ۲۰۰۲ء میں آئی ایس آئی کے اعلیٰ باوردی ذمہ داروں کی آصف زرداری صاحب سے ملاقات کی صورت میں سامنے آیا جس کے دوران میں خود ان سے، جب وہ کیلی فورنیا، امریکا میں تھیں مشورہ کیا گیا اور معاملہ طے کرنے کے لیے شرائط پیش کی گئیں۔ پھر ۲۰۰۴ء میں آصف زرداری صاحب کی رہائی عمل میں آئی۔

اس کے بعد جنرل مشرف سے بے نظیر صاحبہ کی ملاقات کا انتظام شروع ہوا اور بقول بے نظیر بھٹو، جنرل صاحب کے نمایندوں سے بات چیت کرنے کے لیے میری اس شرط پر عمل ہوا کہ جنرل مشرف نے خود مجھ سے ٹیلی فون کر کے اپنے نمایندوں کے مینڈیٹ کا اعتراف کیا۔ ادھر مئی ۲۰۰۶ء کے 'میثاقِ جمہوریت' پر دستخط ہو رہے تھے اور ساتھ ہی مشرف سے سلسلہ جنبانی اپنے عروج پر تھا اور بالآخر اگست ۲۰۰۶ء میں جنرل مشرف سے ٹیلی فون پر رابطہ ہوا اور بطور اعتماد سازی اقدام اس قانون کو اسمبلی سے منظور کرایا گیا، جس میں حدود قوانین میں ترمیم کی گئی تھی۔

جنرل مشرف اور اس کی ٹیم سے جو معاملات طے ہو رہے تھے، ان میں لندن اور واشنگٹن کے حکمران بھی شریک تھے اور فوجی قیادت میں اس وقت کے آئی ایس آئی کے سربراہ بھی۔ اس سیاسی جوڑتوڑ اور معاملہ طے کرانے میں، یہ سبھی کردار گویا 'ضمانت کار' کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر جنوری ۲۰۰۷ء اور جولائی ۲۰۰۷ء میں بے نظیر صاحبہ اور جنرل مشرف کی ملاقاتیں ابوظہبی میں شیخ زاید کے محل میں ہوئیں اور اس طرح ہر دو اطراف کے نمایندوں کی شب و روز کی محنت سے اکتوبر ۲۰۰۷ء میں این آر او کی ولادت واقع ہوئی (ملاحظہ ہو، ص ۲۲۷-۲۳۰)۔ امریکا، انگلستان، بے نظیر صاحبہ اور جنرل مشرف میں جرائم کی سیاہی کو پاک دامنی کا چوغا پہنانے کا جو معاہدہ ہوا، اس کا اصل مقصد انھی کے الفاظ میں یہ تھا کہ موڈریٹ یعنی 'روشن خیال' قیادت کو برسرِاقتدار لایا جائے اور جنرل مشرف اور پیپلز پارٹی مل کر آگے کے مراحل کو طے کریں:

> جنرل مشرف اور ان کے نمایندے مجھے برابر یقین دلاتے رہے کہ اسٹرے ٹیجک فیصلہ کیا جاچکا ہے کہ انتخابی نتائج کچھ بھی ہوں، اعتدال پسند فورم بنا کر مل جل کر کام کیا جائے۔

اس سلسلے میں دستاویزات کا باقاعدہ تبادلہ ہوتا رہا، اور بے نظیر صاحبہ کے الفاظ میں:

> ''این آر او کے تبادلے میں ہماری طرف سے یہ کیا گیا کہ ہم نے اسمبلیوں سے استعفے نہیں دیے، گوکہ اس کو ووٹ بھی نہیں دیا''۔ (ص ۲۲۹)

اس کہانی سے صاف ظاہر ہے کہ این آر او کا قانون اپنی اصل کے اعتبار سے دستور، قانون، سیاست اور اخلاق، ہر پہلو سے غلط اور گندا قانون تھا، بلکہ انگریزی محاورے میں: [it was conceived in sin and fraud اس کی تشکیل میں دھوکا دہی اور گناہ دونوں شامل تھے]۔

اب یہ جناب نواز شریف ہی کی 'وسعت قلبی' ہے کہ اس پوری داستان سے واقفیت کے باوجود وہ پیپلز پارٹی کی حکومت میں شریک ہوئے، پھر وعدہ خلافیوں کے نام پر باہر نکلے اور اب تک 'فرینڈلی اپوزیشن' کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

قانون اور انصاف کا خون

آیئے اب دیکھیں کہ یہ قانون تھا کیا اور اس کے ذریعے کس طرح دستور، قانون، انصاف، سیاست اور اخلاق کو قتل کیا گیا۔

۱- اس کے ذریعے ۱۸۹۸ کے ضابطہ قانون فوجداری (Code of Criminal Procedure) کی دفعہ ۴۹۴ میں یہ ترمیم کی گئی کہ وہ تمام فوجداری مقدمات جو یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے لے کر ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء تک قائم کیے گئے ہیں، ان کو مقدمے کی تکمیل کے بغیر ایک نظر ثانی بورڈ کے ذریعے مرکز اور صوبوں میں ختم کیا جا سکتا ہے۔

۲- عوامی نمایندگی کے قانون ۱۹۷۶ء میں یہ ترمیم کی گئی کہ ریٹرننگ افسر الیکشن کے نتائج کی ایک نقل امیدوار اور اس کے نمایندوں کو دے گا۔

۳- 'قومی احتساب آرڈی ننس ۱۹۹۹ء' میں یہ ترمیم کی گئی کہ کسی رکن پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلی کو، کسی پارلیمانی اخلاقی کمیٹی کی سفارش کے بغیر گرفتار نہیں کیا جا سکے گا۔

۴- اسی 'قومی احتساب آرڈی ننس' میں یہ ترمیم کہ، نیب کے وہ تمام مقدمات جو ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء سے قبل ملک کے اندر یا ملک سے باہر چلائے گئے ہیں، فوراً واپس لے لیے جائیں گے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ فوجداری اور بدعنوانی کے وہ تمام مقدمات جو ۱۹۸۶ء اور ۱۹۹۹ء کے درمیان قائم کیے گئے ہیں، قانون اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر محض سیاسی مفاد پرستی اور نام نہاد 'روشن خیال' قوتوں کو شریکِ اقتدار کرنے کے لیے ختم کر دیے جائیں گے اور اس طرح دیوانی اور فوجداری دونوں نوعیت کے ملزموں کو 'مفاہمت' کے نام پر غسلِ بے گناہی دے کر فارغ کر دیا جائے گا۔

بلالحاظ اس امر کے کہ اس آرڈی ننس کا فائدہ کس کو پہنچا ہے اور کس کس قسم کے جرائم کی اس کے ذریعے 'تطہیر اور صفائی' کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے، ہم پہلے چند اصولی باتیں

عرض کریں گے جن کی تائید عدالتِ عظمیٰ کے مختصر فیصلے سے بھی ہوتی ہے:

ا- قانون کو سیاسی مقاصد اور مفادات کے لیے بالاے طاق رکھا جا رہا ہے اور ملزموں کو ان کے دفاع کا پورا موقع دے کر جرم کے ارتکاب کے تعین یا بے گناہی کے تعین کو یکسر نظرانداز کر کے، حتیٰ کہ سچائی اور اعترافِ گناہ کے قانون اور اخلاقی عمل تک سے بے نیاز ہو کر، محض سیاسی بنیادوں پر اور جوڑ توڑ کے ذریعے ملزموں کو قانون اور عدالت کی گرفت سے نکالا جا رہا ہے۔ یہ عمل انصاف اور قانون کی حکمرانی کے مسلّمہ اصولوں کی کھلم کھلا اور شرمناک خلاف ورزی ہے۔

واضح رہے کہ ریاست، مجرموں کو معاشرے کے نمایندے کے طور پر انصاف کے کٹہرے میں لاتی ہے۔ اصولِ قانون کا یہ مسلّمہ کلیہ و قاعدہ ہے کہ جو چیز معاشرے کے خلاف جرم ہے، اس کے مرتکب کو قانونی ضابطے کے عمل سے گزارے بغیر جرم کے الزام سے بری نہیں کیا جاسکتا۔ ریاست کا یہ اختیار ہے ہی نہیں کہ جب ایک مقدمہ عدالت کے سامنے آ گیا تو وہ اسے واپس لے سکے۔ جرم کا اثبات یا انکار اب عدالت کا کام ہے، سیاسی قیادت یا حکومت کی اجارہ داری نہیں ہے۔ حکومت کا دائرہ کار وہاں ختم ہوجاتا ہے، جب استغاثہ کسی مقدمے کو عدالت کے سامنے لے آتا ہے۔ اس لیے یہ قانون اپنے پہلے ہی دن سے اصولِ قانون کے مسلّمات کے خلاف تھا اور قانون کی نگاہ میں ایک 'گھناؤنا قانون' تھا، جس کا نفاذ ہی ایک جرم تھا، جس کی سزا اس قانون کے بنانے والوں کو ملنی چاہیے نہ کہ اس کے سہارے ملزموں کو غسلِ صفائی دیا جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان کے جرائم کو داخل دفتر کر دیا جائے۔ معاشرہ اور ان جرائم کا نشانہ بننے والے مظلوم انسانوں کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے اور ملک اور قوم کی لوٹی ہوئی دولت کو غاصبوں کی ہوسِ زر پوری کرنے کے لیے چاندی کی پلیٹ پر سجا کر دے دیا جائے۔

ب- دستور نے جن بنیادی حقوق کی ضمانت تمام انسانوں کو دی ہے، ان میں قانون کی نگاہ میں برابری اور مساوات ایک بنیادی حق ہے (دفعہ ۲۵)۔ اس نام نہاد صدارتی فرمان کی شکل میں دستور کی اس شق اور انصاف کے بنیادی اصول کی صریحاً خلاف ورزی کی گئی ہے کہ یکم جولائی ۱۹۸۶ء اور ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء کے درمیان کیے جانے والے جرائم، بدعنوانی اور لوٹ مار کو کھلی چھوٹ دے دی جائے۔ البتہ ان تاریخوں سے پہلے یا ان کے بعد کیے جانے والے جرائم تو جرائم رہیں اور

مجرموں کو قانون کا سامنا کرنا پڑے۔ نیز ان تاریخوں کے درمیان بھی فوجداری اور جواب دہی کے قانون کی گرفت میں آنے والے سب ملزموں کو خلاصی کی یہ سہولت حاصل نہیں ہوگی، بلکہ صرف [اُن خصوصی] ملزموں یا مجرموں کو رعایت حاصل کو ہوگی، جن کے مقدمات کو سرکار واپس لے۔ اس عمل کو قانون کی زبان میں discrimination[امتیازی یا جانب دارانہ سلوک] کہا جاتا ہے جو دستور، قانون اور اخلاق کے خلاف ہے۔ اس طرح 'قانونی برابری' کے اصول کا خون کیا گیا ہے اور ایسا قانون ایک لمحے کے لیے بھی قانونی درجہ نہیں پاسکتا۔

قرآن و سنت اور دستور کی صریح خلاف ورزی

یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ دستور نے پارلیمنٹ کی بالادستی کے اصول کو محکم بنیادوں پر قائم کرنے کے ساتھ پارلیمنٹ پر دو پابندیاں لگائی ہیں۔ ان پابندیوں کی خلاف ورزی پارلیمنٹ اپنے قانون سازی کے اختیار کے استعمال کے باب میں نہیں کرسکتی، اور نہ ان کے برعکس کوئی آرڈی ننس ہی انتظامیہ لاسکتی ہے۔ یہ پابندیاں دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی دفعہ ۸ اور دفعہ ۲۲۷ میں درج ہیں، یعنی بنیادی حقوق کے خلاف اور قرآن و سنت کے احکام کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جاسکتی اور یہ قانون ان دونوں دفعات کی رُو سے دستور پاکستان کے خلاف ہے۔

دستور کی دفعہ ۸ صاف الفاظ میں کہتی ہے:

آرٹیکل ۸- بنیادی حقوق کے نقیض یا منافی قوانین کالعدم ہوں گے:

۱- کوئی قانون یا رسم یا رواج جو قانون کا حکم رکھتا ہو، تناقض کی اس حد تک کالعدم ہوگا جس حد تک وہ اس باب میں عطا کردہ حقوق کا نقیض ہو۔

۲- مملکت کوئی ایسا قانون وضع نہیں کرے گی جو بایں طور عطا کردہ حقوق کو سلب یا کم کرے اور ہر وہ قانون جو اس شق کی خلاف ورزی میں وضع کیا جائے، اس خلاف ورزی کی حد تک کالعدم ہوگا۔

دستور کی دفعہ ۲۲۷ کہتی ہے:

تمام موجودہ قوانین کو قرآن پاک اور سنت میں منضبط اسلامی احکام کے مطابق بنایا جائے گا، جن کا اس حصے میں بطور اسلامی احکام حوالہ دیا گیا ہے، اور ایسا کوئی قانون

وضع نہیں کیا جائے گا جو مذکورہ احکام کے منافی ہو۔

قرآن وسنت کے احکام اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا وَ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ (النساء ۴:۵۸) مسلمانو! اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

مسلمانوں کی صفت قرآن کے الفاظ میں یہ ہے کہ: وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ o (المومنون ۲۳:۸) ''اور جو امانتوں اور وعدے کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِھَآ اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o (البقرہ ۲:۱۸۸) اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقے سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمھیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔

خیانت کی ہر شکل کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o (الانفال ۸:۲۷) اے لوگو جو ایمان لائے ہو جانتے بوجھتے اللہ اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ بنو حالانکہ تم جانتے ہو۔

وَ مَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَ ھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ o (اٰل عمرٰن ۳:۱۶۱) اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا اور ہر نفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

اور اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت جب حساب کتاب

کے لیے بارگاہِ الٰہی میں پیشی ہوگی اور آدمی کے پاؤں اپنی جگہ سے سرک نہ سکیں گے جب تک مِن جملہ اور باتوں کے، اس سے یہ پوچھ گچھ نہ کرلی جائے گی: وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا أَنْفَقَهٗ، یعنی مال کے بارے میں کہ کہاں سے اور کن طریقوں سے اسے حاصل کیا اور کن کاموں پر اور کن راہوں میں اس کو صرف کیا۔

ارشادِ نبیؐ برحق ہے کہ جس شخص نے کسی دوسرے کی کچھ بھی زمین ناحق لے لی تو قیامت کے دن وہ اس زمین کی وجہ سے (اور اس کی سزا میں) زمین کے ساتوں طبق تک دھنسا دیا جائے گا۔

وَمَنْ اَخَذَ مِنَ الْاَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهٖ خُسِفَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِلٰى سَبْعِ أَرْضِيْن (بخاری)

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مَنْ اِنْتَهَبَ نَهْبَةً فَلَيْسَ مِنَّا (ترمذی) ''جس نے کسی کی کوئی چیز زبردستی چھین لی اور لوٹ لی تو وہ ہم میں سے نہیں''۔ اللہ کے رسولؐ نے جہاں مسلمانوں کے درمیان ہدیوں کے تبادلے کو محبت میں اضافے کا ذریعہ قرار دیا ہے وہیں حاکمِ وقت اور فرماں روا کے لیے ہدیوں کے لینے کی مخالفت کی ہے اور انھیں خیانت اور ایک طرح کی رشوت قرار دیا ہے: هَدَايَا الْإِمَامِ غُلُوْلٌ (امام وقت کے ہدیے غلول، یعنی ایک طرح کی رشوت اور خیانت اور ناجائز استحصال کی قبیل سے ہیں)

راشی اور رشوت دینے والے دونوں کو جہنم کی وعید سنائی ہے: الرَّاشِي وَالْمُرْتَشِي كِلَاهُمَا فِى النَّار، اور حضورؐ کا ارشاد ہے:

لَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ يَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَيُقْبَلَ مِنْهُ ، وَلَا يُنْفِقُ مِنْهُ فَيُبَارَكَ لَهٗ فِيْهِ ، وَلَا يَتْرُكُهٗ خَلْفَ ظَهْرِهٖ اِلَّا كَانَ زَادُهٗ اِلَى النَّارِ (مسند احمد)

ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ کسی ناجائز طریقے سے حرام مال کمائے اور اس میں سے پہلے صدقہ کرے، تو اس کا صدقہ قبول ہو اور اس میں سے خرچ کرے تو اس میں برکت ہو، اور جو شخص حرام مال (مرنے کے بعد) پیچھے چھوڑ جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہی ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قانون کے نفاذ میں انسانوں کے درمیان تفریق نہ

کرو اور وہ قومیں جو کمزور لوگوں کو تو قانون کے مطابق سزا دیتی ہیں، مگر صاحبِ اختیار اور طاقت ور اور بالائی طبقے کے لوگوں کو سزا سے بچا لیتی ہیں وہ تباہی کا راستہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ نے بھی چوری کی ہوتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیے جاتے۔

یہ ہیں اللہ، اللہ کے رسولؐ اور خود ہمارے دستور کے واضح احکامات۔ این آر او ان سب کی کھلی کھلی خلاف ورزی تھا اور اپنے اعلان کے پہلے دن ہی سے ایک ناجائز حکم نامہ تھا۔ اچھا ہوا سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسے ختم کر دیا، خس کم جہاں پاک۔

اس قانون سے فائدہ اُٹھانے والے

یہ تو اس قانون کے بارے میں اصولی پوزیشن تھی لیکن ذرا یہ بھی دیکھ لیجیے کہ اس قانون سے فائدہ اٹھانے والوں پر کیا کیا الزامات تھے اور ان میں کیسے کیسے نام وَر شامل تھے ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست

اس بدنامِ زمانہ قانون سے فائدہ اٹھانے والوں کی کُل تعداد ۸۰۴۱ بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے ۷۷۹۳ کا تعلق صوبہ سندھ سے ہے۔ ۳۰۰ اہم سیاست دانوں اور بیوروکریٹس نے اپنے مقدمات ختم کرائے ہیں، جس کے نتیجے میں صرف ان ۳۰۰ افراد نے این آر او کے تحت ۱۶۵ ارب روپے کی بدعنوانیوں، اختیارات کے غلط استعمال اور غبن کے مقدمات معاف کروا کر اپنے کو 'پاک' کرالیا۔ دی نیوز اخبار کی ۲۰ نومبر ۲۰۰۹ء کی اشاعت میں یہ اطلاع قابلِ اعتبار ذرائع سے دی گئی ہے: ۱۶۵ ارب روپے کا اندازہ اصل رقم سے بہت کم ہے، جب کہ صحیح رقم ایک ہزار ارب روپے بنتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے اور اغلب یہی ہے کہ اصل رقم ایک ہزار ارب ہے تو صرف اتنی بات پیش نظر رکھی جائے کہ صرف یہ رقم جو ۱۲ارب ڈالر بن جاتی ہے پانچ سال میں امریکا سے ملنی والی مدد (۷ء۵ بلین ڈالر) سے کہیں زیادہ ہے اور ملک کے لیے بیرونی امداد کی بھیک مانگنے والی تمام رقوم سے زیادہ ہے۔ حکومتِ پنجاب نے جو ۷۷ افراد کی فہرست عدالتِ عظمیٰ کو بھجوائی ہے اس میں صرف ایک سابقہ رکن قومی اسمبلی نے ۱۷۰ ملین ڈالر کا فائدہ اٹھایا ہے۔

پیپلز پارٹی کے مرکزی حکومت کے وزیرِ مملکت برائے قانون افضل سندھو نے جو فہرست

عدالت کو دی ہے (اور اب وہ اس وزارت سے فارغ کر دیے گئے ہیں اور ان کی جگہ ایک ایسے سینئر کو وزارتِ قانون و انصاف کا قلم دان سونپ دیا گیا ہے جن پر حارث اسٹیل مل کے مقدمے میں ساڑھے تین کروڑ روپے ججوں کو خریدنے کرنے کے لیے دیے جانے کا الزام ہے اور بحیثیت وزیرقانون 'قومی احتساب بیورو' (NAB) کا محکمہ خود ان کے ماتحت ہوگا) اس فہرست کی رُو سے اس قانون سے عظیم ترین 'فائدہ' اٹھانے والوں میں پیپلزپارٹی کے شریک چیئرپرسن اور موجودہ صدرمملکت جناب آصف زرداری ہیں۔ ایم کیوایم کی قیادت اور کارکنوں کی بڑی تعداد یعنی ۳ہزار ۷سو ۵۷ افراد بھی اس سے مستفید ہوئے ہیں۔ ایم کیو ایم کے لیڈر جناب الطاف حسین کے خلاف ۷۱مقدمات تھے، جن میں سے ۳۱ کا تعلق قتل اور ۱۱ کا اقدامِ قتل سے تھا۔ واضح رہے کہ روزنامہ دی نیشن کی اطلاع کے مطابق (۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء) اس قانون کے آنے کے بعد ان آٹھ ہزار سے زائد مقدمات کی واپسی کے علاوہ نیب سے ۳۰۰ مزید ان مقدمات کو بھی ختم کر دیا گیا ہے، جو ابھی زیرِتفتیش تھے۔ اس کے علاوہ ساڑھے پانچ ہزار کے قریب مزید مقدمات ہیں جن کی 'قومی احتساب بیورو' اب وسائل نہ ہونے کی وجہ سے پیروی میں مشکل محسوس کر رہا ہے۔

قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں لیکن پاکستان کے دستور کی دفعہ ۲۴۸ کے تحت صدرمملکت اور گورنر صاحبان کو ان کے دورِاقتدار میں ہرقسم کی فوجداری جواب دہی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، جو اسلامی احکام و روایات اور خود جمہوری ممالک کے تعامل سے متصادم ہے۔ کیا امریکا کے دو سابق صدور رچرڈ نکسن اور کلنٹن صاحبان پر عدالت کے ذریعے فوجداری تفتیش و جواب دہی کا معاملہ نہیں ہوا، کہ جس کے نتیجے میں ۱۹۷۴ء میں صدر نکسن کو استعفا دینا پڑا۔ کیا اٹلی کے موجودہ وزیراعظم سلوایو بریاسکونی کو ایسی رعایت ختم کر کے وہاں کی عدالتِ عظمیٰ نے، ان کے خلاف مقدمات کا دروازہ نہیں کھولا۔ حتیٰ کہ اسرائیل میں اس کے ایک صدر اور ایک وزیراعظم پر دورِاقتدار میں کیا فوجداری اور کرپشن کے مقدمات قائم نہیں ہوئے؟ کیا اس مشق سے وہاں کا سیاسی نظام اور جمہوریت کسی خطرے کا شکار ہوئے؟ زرداری صاحب نے این آر او سے جس فیاضی سے فائدہ اٹھایا ہے، اس کی تفصیل سینیر قانون دان جناب محمد اکرم شیخ نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ دی نیوز (۱۸؍اکتوبر ۲۰۰۹ء) میں دی ہے، جو اہلِ نظر کے لیے چشم کشا ہے۔

● ۱۵ فروری ۲۰۰۸ء کو زرداری صاحب نے سندھ ہائی کورٹ میں اپنے تمام زیرسماعت مقدمات سے این آر او کے تحت گلوخلاصی کی درخواست دی، اور ۲۸ فروری کو اس وقت پاکستانی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس عبدالحمید ڈوگر نے عدالت کو ہدایت دی کہ عدالت ان کے مقدمات کو تیزی سے نمٹا دے، نتیجہ یہ کہ ۲۴ گھنٹے میں سندھ ہائی کورٹ نے معاملہ ختم کر دیا۔

● مارچ ۲۰۰۸ء کو زرداری صاحب نے محمد نواز شریف صاحب کے ساتھ 'معاہدۂ مری' کیا۔ اس کے چار دن بعد ۱۲ مارچ کو سوئٹزرلینڈ کے ایس جی ایس کوٹیکنا مقدمے سے زرداری صاحب کو بری کر دیا گیا۔ ۱۴ مارچ ۲۰۰۸ء کو 'بی ایم ڈبلیو مقدمہ' ختم ہوا۔ ۲۴ مارچ ۲۰۰۸ء کو جسٹس نظام اور ان کے صاحبزادے کے قتل کے مقدمے سے زرداری صاحب کو بری قرار دیا گیا۔ ۸/اپریل ۲۰۰۸ء مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے مقدمے سے نجات مل گئی۔ ۱۶/اپریل ۲۰۰۸ء عالم بلوچ کے قتل کے مقدمے سے موصوف کو فارغ کر دیا گیا۔ ۱۳ مئی ۲۰۰۸ء کو موصوف اور ان کے دوسرے شریکِ جرم واجد شمس الحسن (برطانیہ میں پاکستانی ہائی کمشنر اور سوئس مقدمے کی دستاویزات کے ۱۲ ڈبوں کو بنفسِ نفیس سوئس عدالت سے لانے کی شہرت کے مالک) کے ساتھ اسمگلنگ کے مقدمے سے نجات مل گئی۔ اسی طرح ۱۹ مئی ۲۰۰۸ء کو لاہور سے اسمگلنگ ہی کے ایک مقدمہ کا تیا پانچا کر دیا گیا۔ یوں جناب چیئرپرسن مکمل 'غسل' کرنے کے بعد مملکت خداداد پاکستان کی صدارت کی کرسی پر رونق افروز ہوگئے۔

بلاشبہہ این آر او سے فائدہ اٹھانے والے سب افراد اب آزمایش کی کسوٹی پر ہیں۔ انھیں اپنے اُوپر عائد شدہ الزامات کا کھلے انداز میں مقابلہ کرنا چاہیے اور ایک غیر جانب دار عدالتی انتظام کے سامنے اپنی بے گناہی کو ثابت کرنا چاہیے، یا پھر اپنے کیے کی سزا بھگتنا چاہیے۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ اب اس دلدل سے نکلنے کا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی ذمہ داری خود جناب آصف علی زرداری کی ہے۔

سب سے پہلے یہ پاکستان کے مجبُور و مقہور عوام کا حق ہے کہ ان کے حقوق پر ڈاکا ڈالنے والوں کا احتساب ہو اور حقیقی مجرموں کی قرار واقعی سزا ملے۔ قوم کی دولت ان سے واپس لی جائے، نیز جو لوگ بے جا طور پر سیاسی انتقام کا نشانہ بنے ہیں، ان کی پاک دامنی قابلِ بھروسا اور شفاف

عدالتی عمل کے ذریعے ثابت ہو، اور پاکستان کے عوام ان کے بارے میں مطمئن ہوسکیں۔ اس کے ساتھ پاکستان کی ساکھ کو ساری دنیا میں جو شدید نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی بھی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اب بڑے اور چھوٹے سب کو عدالت کے سامنے لایا جائے، اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوسکے۔ ۱۶ دسمبر ۲۰۰۹ء کو عدالت عظمیٰ کے فیصلے کے بعد ملک ہی میں نہیں پوری عالمی برادری میں آصف زرداری صاحب کے معاملے کو ایک ٹیسٹ کیس کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔ محض سیاسی شعبدہ بازی سے اب اس مسئلے کو قالین کے نیچے نہیں چھپایا جاسکتا۔ ۱۷ر دسمبر کے اخبارات نے جو کچھ لکھا، وہ ایک آئینہ ہے۔ اس آئینے میں موجودہ برسرِاقتدار قیادت اپنا اصل چہرہ اور پاکستان کو درپیش اصل چیلنج کے صحیح خدوخال دیکھ سکتی ہے۔ ریکارڈ کی خاطر چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں:

لندن کے اخبار دی ٹائمز کی رپورٹ ملاحظہ ہو:

> پاکستان کے سیاسی لیڈروں میں بدعنوانی بہت پھیلی ہوئی ہے لیکن زرداری کی سرگرمیاں مبینہ طور پر جس بڑے پیمانے پر جاری ہیں اس نے تجربہ کار مبصرین کو بھی صدمے سے دوچار کر دیا۔ صدر پر الزام ہے کہ انھوں نے غیرقانونی ذرائع سے دنیا بھر میں ۱ء۵ ارب ڈالر جمع کیے ہیں۔ نیب نے عدالت کو جو رپورٹ دی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ زرداری کی دولت ذرائع آمدن سے بہت زیادہ ہے۔ بیورو کے عہدے دار نے بتایا کہ کمیشن اور رشوت سے جمع رقم میں سے ۶۰ ملین ڈالر سوئس بنک میں زرداری اور بے نظیر بھٹو کے اکاؤنٹ میں ہیں۔ ایک سوئس عدالت نے زرداری اور بے نظیر بھٹو کو مجرم قرار دیا اور چھے ماہ کی سزاے قید دی جسے اپیل پر معطل کر دیا گیا۔ جناب زرداری عدالت میں کبھی پیش نہیں ہوئے۔

نیویارک ٹائمز اس طرح اس مسئلے کو بیان کرتا ہے:

> کسی دہشت گرد کے حملے کا نشانہ بننے سے خوف زدہ مسٹر زرداری ایوانِ صدر سے شاذ ہی باہر آتے ہیں۔ گذشتہ ۱۰ دنوں میں جب سپریم کورٹ ان کے اختیارات پر بحث کر رہی تھی وہ بیش تر وقت ایوانِ صدر میں رہے۔ گذشتہ ہفتے جب این آر او پر سماعت شروع ہوئی تو پاکستان کے ایک معروف اخبار نے ایک دفعہ پھر انھیں ایسے آدمی

کی حیثیت سے پیش کیا جسے عام طور پر بدعنوان سمجھا جاتا ہے۔

خلیج ٹائمز بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے: ''بدھ کو آنے والے فیصلہ مایوس کن حد تک غیر مقبول زرداری پر ایک بڑا حملہ تھا جو اس کے زوال کا نقطۂ آغاز ثابت ہوسکتا ہے''۔

حقائق کا سامنا کرنے کی ضرورت

بات صرف پاکستانی دانش وروں، سیاسی کارکنوں، صحافیوں ہی کی نہیں، پوری دنیا زرداری صاحب کے معاملے کو ایک 'ٹیسٹ کیس' سمجھتی ہے، اور اب اس سے فرار کی کوئی راہ نہیں بچی۔ اس بات میں کوئی وزن نہیں کہ: ''الزامات عدالت میں ثابت نہیں ہوسکے اور ہم نے اتنی قید کاٹ لی ہے، اس لیے اب ہم قانون کی گرفت سے آزاد ہیں یا یہ کہ سب کچھ سیاسی انتقام کا شاخسانہ تھا''۔

ہر کوئی جانتا ہے اور جسٹس خلیل الرحمٰن رمدے اور مشہور قانون دان ایس ایم ظفر صاحب نے، کہ جو حقائق سے واقف ہیں، صاف لفظوں میں کہا ہے کہ بدعنوانی کے مقدمات کے فیصلے نہ ہونے میں بڑا دخل اس حکمت عملی کا تھا کہ ملزموں نے عدالتی عمل میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے، بار بار اور مسلسل تاخیری حربے استعمال کیے۔ اس کا ثبوت وہ حلفیہ بیانات بھی ہیں جو ملزموں کے یا ان کے وکیلوں نے عدالت کے سامنے پیش کیے اور پیشی پر پیشی لیتے چلے گئے۔ سوئٹزرلینڈ کی عدالت کے سامنے زرداری صاحب کے وکیلوں نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ تک دیے کہ وہ ایسی بیماری (Dementia) میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے حافظہ متاثر ہوتا ہے اور مریض بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ لیکن اس سب کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کھلی عدالت میں شفاف طریقے سے جب تک کوئی الزام ثابت نہ ہو، وہ الزام ہی رہتا ہے۔ لیکن عدالتی عمل کی طوالت کا بہانہ بنا کر جرم سے فرار کا کوئی جواز نہیں ہے۔ زرداری صاحب کے معاملے میں تو بین الاقوامی اداروں اور آزاد اخبارات کی اپنی تحقیق، کئی مغربی ممالک بشمول سوئٹزرلینڈ، اسپین، فرانس اور انگلستان میں عدالتوں کی تحقیق اور کارروائیاں بھی موجود ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔ نیویارک ٹائمز نے اپنی ۹ جنوری ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں اپنے نمایندے جان ایف بورس (John F. Burus) کی مفصل رپورٹ جو *House of Graft: Tracing the Bhutto Millions —— A Special Report* کے عنوان سے شائع کی ہے، جس میں اخبار نے اپنے ذرائع سے تحقیق کا بھی حوالہ دیا ہے، جو قابلِ توجہ ہے:

بھٹو خاندان کے بارے میں پاکستانی تفتیش کاروں کی جانب سے دستاویزات سامنے آنے کے بعد مسٹر بھٹو اور مسٹر زرداری کے بارے میں کچھ تفصیل گذشتہ برس یورپی اور امریکی اخباروں میں آنا شروع ہوئی۔ لیکن زیادہ واضح تصویر اس وقت اُبھر کر سامنے آئی جب اکتوبر میں نیویارک ٹائمز کو دستاویزات کی کئی جلدیں فراہم کی گئیں۔ ٹائمز نے پاکستان، مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکا میں تین ماہ تک خود تحقیقات کی اور ان مرکزی شخصیات سے انٹرویو بھی کیے جن کا ذکر پاکستانی تفیش کاروں نے کیا تھا۔ پاکستان میں تحقیقات کرنے والوں کا کہنا ہے کہ اس وقت تک جن ۱۰۰ ملین ڈالر کا پتا چلا ہے۔ وہ بدعنوانیوں کی کل یافت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ ان کا موقف ہے کہ ۱۹۹۶ء میں بے نظیر بھٹو کی برطرفی کے بعد جو تحقیقات شروع کی گئی تھیں ان سے معلوم ہوا تھا کہ ان کے خاندان اور ساتھیوں نے سرکاری کاموں کے تقریباً ہر دائرے میں ــــ چاولوں کے سودے، سرکاری زمین کی فروخت اور سرکاری ویلفیئر اسکیموں سے حصہ ــــ غیرقانونی منافع اور رشوت کی شکل میں ۱ء۵ ارب ڈالر تک جمع کیے۔

اس سلسلے کی سب سے ہوش ربا شہادت امریکا کے ادارے 'نیشنل سیکورٹی ایجنسی' (NSA) کی وہ ٹیلی فون ریکارڈنگ ہے، جو نومبر ۲۰۰۷ء میں خود محترمہ نے اپنے صاحبزادے بلاول زرداری سے دوبئی سے کی تھی، اور جس میں اپنے بنک اکاؤنٹس کی تفصیل اور ضروری ہدایات دی گئی تھیں۔ یہ پوری تفصیل رون سسکند (Ron Suskind) نے اپنی کتاب *The Way of The World* (مطبوعہ ۲۰۰۸ء) میں دی ہے۔

یہ سب باتیں ساری دنیا میں زبان زدِ خاص و عام ہیں اور ان کا سامنا کیے بغیر ان الزامات سے گلوخلاصی ممکن نہیں۔ ہم اب بھی یہی کہتے ہیں کہ الزامات میں بڑا وزن ہے اور واقعاتی شہادت زوردار ہے، تاہم مسئلے کا حل وہی ہے جو عدالتِ عظمیٰ نے تجویز کیا ہے، یعنی مقدمات اور الزامات کا کھلی عدالت میں مقابلہ۔ سب کو اپنے دفاع کا پورا حق اور موقع ملنا چاہیے مگر محض سیاسی انتقام کا واویلا حقائق سے فرار اور الزامات کو ختم نہیں کرتے بلکہ شبہات کو بڑھا دیتے ہیں۔

سرے محل اور سوئس بنک کے ۶۰ ملین ڈالر تو زرداری صاحب کے اپنے تحریری اعتراف کے مطابق ان کی ملکیت ہیں۔ لیکن جو دستاویزات موجود ہیں ان کے مطابق تو دعویٰ کیا جارہا ہے کہ ان کے پاس یہاں پاکستان میں ۲۲ کروڑ اور ملک سے باہر ۱ء۵ بلین ڈالر کے اثاثہ جات ہیں۔ اگر یہ ہوائی بات ہے تو سچائی کو ثابت کرنا چاہیے اور اگر یہ رقوم اور اثاثہ جات ہیں تو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کیسے حاصل کی گئیں۔ اس لیے کہ زرداری صاحب نے ۱۹۹۰ء میں پارلیمنٹ کے سامنے اپنے اثاثہ جات میں اپنی جس دولت اور آمدنی کا ذکر کیا ہے، اس سے تو آج کی دولت کے عشرعشیر کی بھی توجیہہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے سیاسی محاذ آرائی مسئلے کا حل نہیں۔ حقائق کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

ہم یہ سب حقائق بڑے دکھ بلکہ شرمندگی کے احساس کے ساتھ نذرِ قارئین کر رہے ہیں لیکن یہی ہے وہ داستان جس نے پوری دنیا میں پاکستان کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہے۔ پورے عالمی میڈیا میں ہماری سیاسی قیادت اور کارفرما عناصر کی جو تصویر پیش کی جارہی ہے، وہ ہر پاکستانی کے لیے شرم اور خفت کا باعث ہے۔ ملک کو بدعنوانی کا جو ناسور کھائے جا رہا ہے، اس نے ملک کو اخلاقی بگاڑ، معاشی تباہی اور سیاسی خلفشار کی آماج گاہ بنا دیا ہے۔

ہماری اخلاقی گراوٹ کی انتہا ہے کہ کھلی کھلی بدعنوانی و بددیانتی کے مرتکب افراد اپنے گھناؤنے کرتوتوں پر نادم ہونے کے بجاے چوری اور سینہ زوری کی راہ پر گامزن ہیں۔ قتل اور اغوا کے ملزم سرعام کہہ رہے ہیں کہ ہم پر کرپشن کا تو کوئی الزام نہیں ہے۔ گویا مال لوٹنے والوں کے مقابلے میں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنا، بوریوں میں لاشوں کے 'تحفے' بھیجنا اور زندہ انسانوں کو تعذیب اور ان کی ہڈیوں کو برموں سے چھیدنا (drilling) کوئی جرم نہیں، اجتماعی خدمت تھی۔ جو قوم اپنے مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں نہ لا سکے، وہ اجتماعی بگاڑ اور تباہی سے بچ نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ پوری قوم نے عدالتِ عظمیٰ کے ۱۶ دسمبر کے فیصلہ پر سکھ کا سانس لیا ہے اور عدلیہ کے اس اقدام سے مظلوم انسانوں کی آنکھوں کو اُمید کی ایک کرن نظر آنے لگی ہے۔ لیکن جہاں اس ملک کے عوام اور تمام مظلوم طبقات نے اس فیصلے کا خیرمقدم کیا اور چین کا سانس لیا ہے، وہیں اقتدار کے ایوانوں میں ہلچل مچ گئی ہے۔ مفاد پرست عناصر اور ان کے نام نہاد لبرل دانش ور میدان

میں کود پڑے ہیں اور جمہوری نظام کے خلاف سازشوں اور اداروں کی کش مکش کا واویلا کر رہے ہیں۔

عدلیہ کے فیصلے پر اعتراضات

یہ بھی ایک عجب تماشا ہے کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر پیپلز پارٹی کے ترجمانوں اور اس کے ہم نوا دانش وروں اور صحافیوں نے کھل کر تنقید کی ہے۔ بلاشبہہ ہر فیصلے کا قانون اور مسلّمہ اصولِ انصاف کی روشنی میں جائزہ لیا جانا چاہیے، تاہم جو اعتراضات کیے جارہے ہیں ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک سیاسی اعتراضات جن میں کہا گیا ہے عدالت نے مسئلے کو سیاسی رنگ دے دیا ہے اور فیصلے میں ایک سیاسی پیغام بھر دیا ہے۔ کچھ نے اس سے بھی بڑھ کر کہا ہے کہ جج انتقام لے رہے ہیں۔ کچھ تو یہاں تک چلے گئے ہیں کہ اسے ججوں اور فوجی مقتدرہ کی طرف سے 'جوابی حملہ' قرار دیا جارہا ہے۔

ہماری نگاہ میں یہ تمام اعتراضات نہ صرف یہ کہ حقائق سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، بلکہ بیمار ذہنوں اور مجرم ضمیروں کی عکاسی کرتے ہیں۔ زرداری صاحب کی ۲۷ دسمبر ۲۰۰۹ء کی نوڈیرو کی تقریر بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہے اور ان کی پوزیشن کو مزید کمزور کرنے کا باعث ہوئی ہے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ پیپلز پارٹی کی موجودہ قیادت فرار اور تصادم کا یہ راستہ اختیار نہ کرے۔ اس میں اس کا اور ملک کا خسارہ ہے۔ حقائق کا سامنا کرے اور دستور اور قانون کے دائرے میں رہ کر اپنا دفاع کرے۔ اس کے بغیر اسے نہ سندِ جواز حاصل ہوسکتی ہے اور نہ اعتبار ہی بحال ہوسکتا ہے۔

رہے دوسرے اعتراضات، تو ان کا دلیل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہم مختصراً ان کا جائزہ لیتے ہیں:

- **اختیارات سے تجاوز:** پہلا اعتراض یہ ہے کہ سپریم کورٹ عدالتی فعالیت (judicial activism) کا راستہ اختیار کر رہی ہے اور یہ اس کا اپنے دائرۂ کار سے باہر جانے اور انتظامیہ اور پارلیمنٹ کے دائرۂ کار میں مداخلت کے مترادف ہے''—— ہماری نگاہ میں عدالتی فعالیت اور عدالتی نظم و ضبط دونوں کے حق میں مضبوط دلائل موجود ہیں اور دنیا کے مہذب اور جمہوری ممالک میں دونوں ہی کی مثالیں ملتی ہیں۔

ہماری دیانت دارانہ راے ہے کہ مارچ ۲۰۰۹ء میں عدلیہ کی بحالی کے بعد سے عدلیہ نے

پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے اور دستور کے تحت دیے گئے اختیارات سے کہیں تجاوز نہیں کیا۔ دستور کی دفعہ (۳) ۱۸۴ بڑی واضح ہے کہ عدالت کو بنیادی حقوق کی حفاظت کے باب میں عوامی اہمیت کے مسائل پر ازخود کارروائی کا اختیار ہے۔ عدالت نے اس اختیار کو عوام کے حقوق کے تحفظ کے لیے پوری احتیاط سے استعمال کیا ہے۔ لیکن چونکہ اس کی زد حکمرانوں کی بدعنوانیوں اور بے اعتدالیوں پر پڑتی ہے، اس لیے وہ اس پر چیں بہ جبیں ہیں۔ اس نوعیت کی عدالتی فعالت کی مثالیں امریکا، یورپی ممالک اور خود بھارت میں بے شمار موجود ہیں۔ حتیٰ کہ بھارت کی سپریم کورٹ نے تو دہلی میں بسوں سے خارج ہونے والے دھوئیں تک کا نوٹس لیا اور حکومت نے عدالت کے احکام کی پاس داری کی۔

ہماری نگاہ میں اداروں کے تصادم کی جو بات کی جارہی ہے وہ حقائق کے منافی تو ہے ہی لیکن اس کے اندر ملک میں فساد، خرابی اور بگاڑ کی کیفیت پیدا کرنے کا خطرہ ہے اور یہ سب کے لیے بہت نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے ملک کی سیاسی قیادت، خصوصیت سے حزبِ اختلاف اور میڈیا کو اس کا سختی سے نوٹس لینا چاہیے اور برائی کو آغاز پر ہی مٹانے کا کردار ادا کرنا چاہیے۔

● **فرد یا جماعت کو ہدف بنانا:** دوسرا بڑا اعتراض یہ کیا جارہا ہے کہ: ''اس فیصلے کے نتیجے میں خاص طور پر ایک فرد یا جماعت کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ میڈیا کے کچھ عناصر اس سلسلے میں بہت منفی کردار ادا کر رہے ہیں''۔ ہماری نگاہ میں یہ الزام بھی کُلی طور پر بدنیتی پر مبنی ہے۔ عدالت کے مذکورہ فیصلے میں کسی فرد کا ذکر نہیں ہے۔ تمام بات اصولی اور عمومی حوالہ لیے ہوئے ہے۔ اب اگر اس کی زد چند خاص افراد یا جماعتوں پر پڑتی ہے تو یہ ان کو سمجھنا چاہیے کہ اس کی وجہ ان کے اپنے رویے اور طور طریقے ہیں، جن کی اصلاح کے لیے انھیں فکر کرنی چاہیے نہ کہ آئینے میں چہرے کے داغ دیکھ کر وہ آئینے کو چکنا چور کرنے کی سعی بلیغ فرمائیں۔

اس باب میں یہ بات بھی بڑی پریشان کن اور نقصان دہ ہے کہ میڈیا کی آزادی اور خصوصیت سے چند لائقِ احترام صحافیوں اور اینکر پرسنز کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ صدر سے لے کر وزیروں اور پارٹی لیڈروں تک نے ان پر رکیک حملے کیے ہیں۔ یہ آمرانہ ذہن اور مجرم ضمیر کی علامت ہے۔ قوم کو ایسی جارحیت کا دلیل کے ساتھ اور جم کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ عدلیہ اور میڈیا کی آزادی بہت بڑی نعمت ہے اور بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ ان پر اقتدار کا

یہ حملہ ہرگز قابلِ برداشت نہیں۔ صحافیوں کو نشانہ بنانے کی بات تو اب اس مقام تک پہنچ گئی ہے کہ وزرا کے بچے تک ان کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اگر اس روش کا فوری طور پر اور سختی سے سدباب نہ کیا گیا تو یہ شاخسانہ ملک کی آزادی اور اس کے اداروں کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

● **مہلت کیوں دی؟** ایک تیسرا اعتراض یہ ہے: ''اگر عدالت کو اس آرڈی ننس کو اس کے یومِ پیدایش سے باطل قرار دینا تھا تو اس کو چار مہینے کی نئی زندگی عطا کر کے پارلیمنٹ کو کیوں بھیجا؟'' بلاشبہہ ہماری نگاہ میں اس کی ضرورت نہیں تھی اور عدالت اپنے ۳۱ جولائی کے فیصلے میں بھی اسے باطل قرار دے سکتی تھی، لیکن غالباً اس نزاکت کی بنا پر ایسا نہ کیا گیا، چونکہ اس کو بظاہر سیاسی مصالحت کے لیے استعمال کیا گیا ہے اس لیے یہ موقع پارلیمنٹ اور سیاسی عمل کو دیا جائے کہ وہ خود اس کی اصلاح کرلیں۔ پارلیمنٹ کا کام محض اس آرڈی ننس کی تائید اور منظوری نہیں بلکہ اس کی تبدیلی بھی ہوسکتا تھا لیکن پیپلزپارٹی کی حکومت نے پہلے تو اس کو اندھا دھند طریقے سے منظور کرانے کی کوشش کی اور کمیٹی میں اپنے اتحادیوں کے ذریعے اسے تقریباً منظور کرالیا، لیکن پھر پارلیمنٹ اور عوام کا ردعمل دیکھ کر اسے واپس لیا۔ یہ ساری کارستانی حکومت کی بدنیتی کا بین ثبوت ہے۔ حالانکہ حکومت کے پاس یہ موقع تھا کہ وہ سیاسی جماعتوں اور پارلیمانی پارٹیوں کو شریکِ مشورہ کر کے اس کو یکسر بدل ڈالتی اور بدعنوانی کی 'دھلائی' کے بجاے اسے حقیقی بدعنوانی پر گرفت کا قانون بنا دیتی۔ چونکہ پارلیمنٹ اس امتحان میں ناکام رہی اور عدالت نے بجاطور پر ایک غلط قانون کو غلط قرار دے کر اپنی ذمہ داری ادا کی ہے، اس پر اس کی تحسین ہونی چاہیے، نہ کہ نکتہ چینی!

● **دستور کی اسلامی دفعات پر اعتراض:** چوتھا اعتراض سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے اور اس ملک کے نام نہاد لبرل طبقے کے ذہن کا ترجمان ہے۔ عاصمہ جہانگیر جیسی حقوقِ انسانی کی علَم بردار خاتون بھی اس فیصلے پر تلملا اُٹھی ہیں کہ عدالت نے دستور کی دفعہ ۲ الف، ۶۲، ۶۳ اور ۲۲۷ کا حوالہ کیوں دے دیا۔ یہ اس طبقے کے اسلام سے گریزپا (الرجک) ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔ ان کو یہ بھی اعتراض ہے کہ دستور میں یہ ترامیم جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ہوئیں۔ لیکن وہ یہ بھول جاتی ہیں کہ پارلیمنٹ نے ان کی توثیق کی ہے، تمام جماعتوں نے ان کو قبول کیا ہے اور میثاقِ جمہوریت میں دستور کے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شکل میں بحالی کا جو عہدوپیمان کیا گیا ہے

اس میں یہ سب دفعات من وعن شامل ہیں۔ ایوب خان کے مسلط کردہ مسلم فیملی لاز پر تو کبھی یہ تشویش اس طبقے کو نہیں ہوئی کہ ایک آمر مطلق نے اسے مسلط کیا تھا اور دستور میں بھی اسے تحفظ ایک آمر ہی نے دیا تھا، لیکن پاکستان کے اسلامی تشخص اور کردار کو دستور میں واضح کرنے والی جو ترمیم بھی ہوئی وہ ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بے ہودہ اعتراض بھی کیا جا رہا ہے کہ: ''امانت، دیانت اور صادق و امین ہونے کا تعین کون اور کیسے کرے گا؟'' حالانکہ دنیا کے تمام قانونی اور اخلاقی ضابطوں میں یہ باتیں معروف ہیں۔ برطانوی دستور و قانون کے بہترین شارح سر آئیور جیننگز نے اپنی کتاب Cabinet Government (وزارتی حکومت) میں کھل کر یہ بحث کی ہے کہ جمہوریت میں اربابِ اختیار و اقتدار کے لیے سب سے ضروری وصف دیانت اور امانت ہے۔ اگر اہلیت کی کمی ہو تو وہ مشیروں اور اہل ترین افراد کی مشاورت سے دُور کی جاسکتی ہے، لیکن اگر دیانت نہ ہو تو پھر ایسے فرد کا حکمرانی کا حق ختم ہو جانا چاہیے۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے بددیانت اور بدعنوان افراد کبھی بھی عوام یا قانون کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکے۔

ان اعتراضات کے علاوہ ایک سلسلہ اس بدزبانی اور یاوہ گوئی کا ہے، جس کا سہرا زرداری صاحب کے خاص حواریوں کے سر ہے۔ زرداری صاحب خود اداروں کے تصادم اور مخالفین کی آنکھ پھوڑنے کی باتیں کر رہے ہیں اور من چہ می سرایم وطنبورۂ من چہ می سراید کے مترادف جو گُل کھلا رہے ہیں ان پر ماتم تو کیا ہی جائے گا، لیکن وہ خطرے کی گھنٹی کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کے سینیر راہنما اور اسمبلی میں چیف وہپ خورشید شاہ صاحب ذرا محتاط انداز میں 'سندھ کارڈ' ان الفاظ میں استعمال کرتے ہیں کہ: ''سندھ نے وفاق کے لیے دو وزراے اعظم کی قربانی دی ہے، اب مزید کوئی قربانی نہیں دیں گے''، جب کہ سندھ کے صوبائی وزیر اور قومی اسمبلی کی اسپیکر صاحبہ کے شوہر نامدار ڈاکٹر ذوالفقار مرزا پاکستان کو توڑنے اور بموں سے جہاز اڑانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ پنجاب کے صوبائی صدر رانا آفتاب صاحب، سینیر صوبائی وزیر راجا ریاض مزاحمت کی سیاست کی وارننگ دیتے ہیں، لاشوں کو گرانے کی بات کرتے ہیں۔

یہ سارے بیانات بڑے تشویش ناک اور خطرناک رجحانات اور عزائم کی خبر دیتے ہیں۔

جمہوریت کو خطرہ عدلیہ یا صحافت سے نہیں، بدعنوانی کے مرتکب افراد اور تصادم کی سیاست کے ان دعوے داروں سے ہے۔ اس روش کو برداشت کرنا ملک و قوم کے لیے زہر قاتل کی مانند ہے۔ تمام دینی اور سیاسی قوتوں کا فرض ہے کہ سیاست کے اس رُخ پر سختی سے احتساب کریں اور جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی سے نہ اُترنے دیں۔

احتساب کے مؤثر نظام کی ضرورت

آخر میں ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں حکومت کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ عدالتِ عظمٰی کے اس اور دوسرے تمام فیصلوں پر دیانت سے ان کے الفاظ اور اس کی روح کے مطابق عمل کرے اور اس دوغلی سیاست کو ترک کردے کہ زبان سے کہے کہ ہم عدالت کے فیصلے کا احترام کرتے ہیں، لیکن عملاً اس فیصلے کے ہر تقاضے کو نہ صرف نظرانداز کرے بلکہ اس کے برعکس اقدام کرے۔

ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ عدالت کے فیصلے پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ فوری طور پر قومی احتساب کا مؤثر اور قابلِ اعتماد نظام قائم کیا جائے۔ نیب کا ادارہ اپنی افادیت کھو چکا ہے اور یہ وزارتِ قانون کی گرفت میں ہے جس سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ آزادانہ قانونی کارروائی اور ایسی قابلِ بھروسا عدالتی اتھارٹی جو سب کو شفاف انصاف دے سکے وقت کی اولین ضرورت ہے۔ میثاقِ جمہوریت میں دونوں بڑی جماعتوں نے اس کا وعدہ بھی کیا ہے۔ کرپشن کے عفریت کو قابو میں کرنے کے لیے تفتیش اور تحکیم کے آزاد اور قابلِ اعتماد ادارے کا وجود ناگزیر ہے۔ اس مقصد کے لیے پارلیمنٹ میں جو مسودہ قانون حکومت لائی ہے، وہ غیرتسلی بخش اور ناقابلِ قبول ہے۔ وہ بدعنوانی کے تحفظ کا ذریعہ تو بن سکتا ہے، اس کے خاتمے کا منبع نہیں بن سکتا۔ اس لیے اولین اہمیت احتساب اور تفتیش کے مناسب ادارے اور انتظام کے لیے پارلیمنٹ میں قانون سازی اور بے لاگ طور پر اس ادارے کا قیام ہے ورنہ ملک بدعنوانی کی لعنت سے نجات نہیں پاسکے گا اور قومی دولت، قوم کی بہبود کے لیے استعمال ہونے کے بجاے چند مفاد پرستوں کی عیاشیوں کا سامان فراہم کرتی رہے گی۔ اس طرح ملک کو بالآخر تصادم اور انارکی کی طرف جانے سے روکنا مشکل ہوگا۔

تفتیش کا آزاد نظام، احتساب کا قابلِ اعتماد ادارہ اور آزاد میڈیا ملک کو اس دلدل سے نکالنے میں سب سے مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں، نیز قانون کے ساتھ اخلاق کی قوت کا استعمال بھی

وقت کی ضرورت ہے۔ کسی قوم کی قوت کا آخری منبع افراد اور قوم کا اخلاق ہے۔ خود قانون بھی اخلاق کے بغیر اپنا اصل کردار ادا نہیں کرسکتا۔ اخلاق محض وعظ و نصیحت کا نام نہیں ہے، بلکہ ہرسطح پر کردار سازی اور قیادت کا بہتر نمونہ اس کا اصل سرمایہ ہے۔ مقصد کا شعور، خوداعتمادی، نظم و ضبط اور اتحاد اور یگانگت کے اصول ہی قوموں کو ترقی کی راہ پر لے جاتے ہیں۔ خودغرضی، ظلم اور حقوق کی پامالی، نفسانفسی اور تصادم زوال کا باعث ہوتے ہیں۔ قائداعظم نے قیامِ پاکستان کے وقت ۱۱راگست ۱۹۴۷ء کو دستور ساز اسمبلی سے جو خطاب کیا تھا، اس میں ایک بڑا بنیادی نکتہ یہی تھا کہ کرپشن اور بدعنوانی کے ساتھ کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ لا اینڈ آرڈر کے قیام اور جان و مال کے تحفظ کے بعد جس چیز کو قائداعظم نے سب سے اہم قرار دیا وہ رشوت اور کرپشن سے نجات ہے۔ قائداعظم کا ارشاد تھا:

> (رشوت اور بدعنوانی) دراصل یہ ایک زہر ہے۔ ہمیں نہایت سختی سے اس کا قلع قمع کردینا چاہیے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں مناسب اقدامات کریں گے، جتنی جلد اس اسمبلی کے لیے ایسا کرنا ممکن ہو۔ (قائداعظم: تقاریر و بیانات، ج۴، ص۳۵۸)

۱۶ دسمبر ۲۰۰۹ء کے عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے کے بعد قائداعظم کے اس ارشاد پر فوری عمل کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کیا یہ قوم اور قومی قیادت ایک بار پھر اس نادر موقع کو ضائع کر دے گی، یا وقت کی ضرورت کا احساس کرکے ہم سب اس لعنت کا قلع قمع کرنے کے لیے قانون، اخلاق، راے عامہ اور اجتماعی اصلاح کا پُرامن اور معقول راستہ اختیار کرنے کے لیے کمربستہ ہوجائیں گے؟

قائداعظم نے اپنا آخری پیغام اس قوم کو ۶ راگست ۱۹۴۸ء عیدالفطر کے موقع پر دیا اور آج ہم پاکستان کے تمام لوگوں کو اس پیغام کی یاددہانی کراتے ہیں:

> میں آپ سے یہ اپیل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں، آپ اسے الفاظ اور زبان کا کوئی سا جامہ پہنا دیں، میرے مشورے کا لُبِ لباب یہی نکلے گا کہ ہر مسلمان کو دیانت داری، خلوص اور بے غرضی سے پاکستان کی خدمت کرنی چاہیے۔ (ایضاً، ص۵۰۲-۵۰۳)